پس نو آبادیاتی نظریہ سازی کی روایت
(فرانزفینن، ایڈورڈ سعید اور علی شریعتی کے حوالے سے)

ڈاکٹر ناہید قمر [1]

Abstract:

"Post colonial theory is concerned with issues which are needed to be discussed, and emphasizes the fact that we can only investigate the issues of the present by dealing with them from the critical standpoint of the past. It is a known fact that the people of post colonial societies are still subject in one way or another to overt or subtle forms of neo-colonial domination and independence has not changed the situation, which testifies to the fact that post-colonialism, is a continuing process of resistance and reconstruction. This article presents a critical over-view of the works of major post colonial theorists Franz Fanon, Edward Said and Ali Shariati."

پس نو آبادیاتی نظریہ اس ادب کے تنقیدی جائزے کا پیمانہ ہے جو سابقہ نو آبادیوں میں تخلیق ہوا۔ خصوصاً مغربی ممالک مثلاً برطانیہ، فرانس اور سپین کی نوآبادیاں۔ یہ نظریہ سامراجیت کی تہذیبی باقیات کے تجزیے، مزاحمت اور ردِ عمل کاا حاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف نظری مباحث مثلاًشناخت (بشمول صنف، نسل اور طبقات) زبان، نمائندگی اور تاریخ کے جائزے کے ذریعے یورپی اقوام اور ان ممالک کے مابین وسیع تر باہمی تعاون کو بھی زیر غور لاتا ہے جو ان کی نوآبادیاں تھیں۔ کیونکہ نو آباد سماج میں نو آباد کاروں کے توسیع پسندانہ عزائم کے تحت مقامی زبانوں اور ثقافتوں کو یا تو حاشیے پر دھکیل دیا گیا یا تقریباً معدوم کردیا گیا۔ سامراجیت کے اثرات کے تحت ان ممالک کی زبان، ادبی روایات اور ثقافتی ادارے دوہری شناخت یا کولونائزر اور کولونائزڈ کے مابین ثقافتی امتیازات کے اوغام کے حامل بن گئے۔ ساٹھ کی دہائی میں فرانزفینن کی تصنیف''افتادگان ِخاک'' نے اس امر کی جانب توجہ مبذول کروائی کہ تیسری دنیا کے ممالک بالخصوص وہ جو مغربی استعمار کے زیرِ تسلط رہے، ان میں مغرب کی ذہنی مرعوبیت کے تحت اپنی ثقافت اور تاریخ کی طرف رویہ مدافعتی نوعیت کا رہا۔ بعد ازاں ایڈورڈ سعید کی تصانیف ''مشرق شناسی'' اور ''ثقافت اور سامراج'' میں اس نظریے کو زیادہ مربوط انداز میں پیش کیا گیا کہ فکری مغلوبیت کے باعث فاتح قوم کا منشا مفتوح قوم کے بیانیے میں شامل ہوجاتا ہے۔ پس نو آبادیاتی نظریہ سازی کے ضمن میں اہم ترین کام فرانز فینن اور ایڈورڈ سعید کا ہے۔ تاہم اس مضمون میں علی شریعتی کے نظریات کا جائزہ بھی پس نو آبادیاتی تناظر میں لیا گیا ہے۔

فرانز فینن

فرانز فینن کا شمار جنگ عظیم دوم کے بعد سابقہ نو آبادیوں میں شعور کی ڈی کولونائزیشن کے عمل کو تقویت دینے والے اہم ترین نظریہ سازوں میں ہوتا ہے۔ اس کا مختصر عرصہ زندگی فرانسیسی استعمار کے خلاف الجیرین عوام کی جدوجہد آزادی میں شرکت، نیز نو آبادیاتی تناظر میں آزادی کے حصول کی خاطر انسان جدوجہد کے گہرے تجزیے کے باعث اہمیت کا حامل ہے۔ افریقی شعور کی تفہیم میں فینن کی تحریریں بڑی حد تک مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس کی بڑی وجہ دوہری شناخت کے ذریعے ایک انسان دوست رد نوآبادیاتی ثقافت کی تشکیل کا حامل کردار ہے۔

فینن کی تحریروں کا پس منظر جاننے کی کوشش کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح وہ ان

---

[1]اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد

لوگوں کے لئے جو معاشرے کے پسے ہوئے استحصال زدہ طبقات کے لئے سماجی انصاف کے حصول کی جدوجہد کر رہے ہوں، ایک اثرانگیز امید افزا شخصیت بنا۔ فینن کی پہلی تصنیف (Black Skin, White Masks)ایک اساسی نوعیت کے غیر نسلی انسان دوستی پر مبنی نظریے کی تشکیل کرتی ہے جو نہ تو سفید فام اقوام کی حاکمیت کی بات کرتا ہے اور نہ ہی ردِ عمل کے طور پر سیاہ فام اقوام کی برتری کا قائل ہے۔ تاہم اس کی بعد میں آنے والی تحریروں میں نوآبادیاتی عوام کے استحصال پر ارتکاز واضح طور پر نمایاں ہے۔ اس کی پہلی تصنیف نے فرانس کے سیاہ فام شہری کی جانب سے معاشرے میں اس کی اپنی سیاہ فام شناخت کے ضمن میں انسان دوستی کے ایک نئے نظریے کو جنم دیا۔ اس کی دیگر تصانیف A Dying colonialism اورThe Wretched of the Earth مغرب کے اس خود ساختہ تصور کو رد کرتی ہیں کہ صرف مغربی تہذیب ہی تہذیب و ثقافت کا عالمی معیار ہے کیونکہ اس تصور کے ذریعے ہی مغرب نے نوآبادیوں کے مقامی عوام کی اپنی عزت و وقار اور اپنی مقبوضہ زمینوں کے حصول کی کوششوں کو ناکام بنایا۔ یہ فینن کا انسان دوستی کا تصور اور ڈی کولونائزیشن کے نظریے کی اخلاقی بنیادیں استوار کرنے کی نامختتم کوشش ہی ہے جو سابقہ نوآبادیوں کے ہر فرد کو غلام سمجھنے کے بجائے اس کی انفرادی شناخت اور وقار کے حصول میں مدد دیتی ہے اور یہی فینن کی اہمیت ہے۔

پس نوآبادیات کے ابتدائی نظریہ ساز کی حیثیت سے فرانز فینن اپنی تصنیف Black skin White Mask (1952)اور The Wretched of the Earth (1961)میں کولونائزڈ اور کولونائزر دونوں کی نفسیات پر سامراجیت کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے کہ مقامی افراد میں کولونائزر کے رویے سے ذات کا ایک ایسا تصور جنم لیتا ہے جو کولونائزر کے مقاصد کے مطابق ہوتا ہے، جبکہ کولونائزر میں احساس برتری جنم لیتا ہے۔ فینن اس خیال کے ذریعے پس نو آبادیات کا ایک نفسی تجزیاتی نظریہ پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یورپین کے لئے ذات کا تصور ایک 'مقابل' سے تعلق میں تشکیل پاتا ہے۔ نفسیاتی خلاء کو پر کرنے کے لئے مقامی شخص مغربی اقدار مذہب، زبان اور سماجی سرگرمیوں کو اپنا کر اور اپنی ثقافت کو ردکر کے حتی الامکان سفید فاموں جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے۔ اس رویے یا مظہر کو فینن سیاہ جلد پر سفید نقاب کا نام دیتا ہے جس کا نتیجہ دوہری شخصیت یا شناخت کی صورت میں نکلتا ہے۔ مزید برآں مقامی افراد میں عدم تحفظ کے احساس کا نتیجہ جارحیت کی شکل میں سامنے آتا ہے جو کہ خود اثباتیت کی ایک صورت ہے۔ یہ جارحیت کولونائزڈ کے اپنے ہم وطنوں کے خلاف بھی سامنے آسکتی ہے جب اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ جتنا بھی کوشش کر لے سفید فام جیسا نہیں بن سکتا۔ فینن کہتا ہے کہ سامراجی نظام کے تحت ہونے والی قبائلی جنگیں اسی جارحیت کی ایک مثال ہیں جن میں قبائلی عوام ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہوتے ہیں۔

"افتاد گانِ خاک"میں فینن ثقافتی قومیت کی اہمیت کا ادراک کرتے ہوئے ایک قومی ثقافت کا نظریہ پیش کرتا ہے جس کے نتیجے میں قومی شعور کی تشکیل ہوسکے۔ یہاں وہ قومی ثقافت کی تشکیل کے لئے تین مراحل کا تعین کرتا ہے۔

مقامی فرد، کولونائزر کی تہذیب و ثقافت کو اپنانے اور اپنی ثقافت کو رد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ (ہومی بھا بھانے اس رویے کو نقالی کا نام دیا ہے)۔

مقامی فرد، دونوں تہذیبوں کے مابین امتیازات کی خلیج کو تسلیم کر کے اس امر کا ادراک کرتا ہے کہ وہ کبھی بھی اس حد تک سفید فام نہیں ہوسکتا کہ سفید فام اس سے برابری کا سلوک کریں۔ نتیجتاً وہ اپنی تہذیب و ثقافت کے مطالعے اور تفہیم کی جانب از سرِ نو راغب ہوتا ہے۔

> ''تیسرے مرحلے پر مقامی فرد مکمل طور پر اینٹی کولونیل ہوجاتا ہے جس میں اپنی تہذیب پر تنقیدی نقطہ نگاہ کا حصول بھی شامل ہے۔ ''پہلے دور میں مقامی دانشور اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ اس نے قابض قوت کی تہذیب کو اپنے اندر سمو لیا ہے--- یہ دور غیر مشروط انجذاب کا ہوتا ہے--- دوسرے دور میں مقامی باشندہ پریشان نظر آتا ہے، وہ یہ یاد کرنے کا فیصلہ کرتا ہے کہ وہ

کیا ہے--- مستعار جمالیات اور دیگر آسمانوں کے نیچے دریافت شدہ نظریات زندگی کی روشنی میں پرانے قصے کہانیوں کی نئی تعبیریں ہوتی ہیں--- بالآخرتیسرے دور میں جسے جدو جہد کا دور بھی کہا جاتا ہے، خود کو لوگوں میں اور لوگوں کے ساتھ گم کرنے کی کوشش کے بعد اب مقامی باشندہ انہیں متحرک کرتا ہے--- اب وہ انہیں بیدار کرنے والا بن جاتا ہے اور اس طرح ایک جنگجو ادب، انقلابی ادب اور قومی ادب کی تشکیل ہوتی ہے۔''(۱)

تاہم فینن نے قومی ثقافت کے کچھ خوشگوار مضمرات کی بھی نشاندہی کی ہے کہ اس کا نتیجہ عدم برداشت اور زینو فوبیا کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ فینن کو ادراک ہے کہ کولو نیل ثقافت کے غلبے کے مقابل قومی ثقافت کا مقامی تقاضوں کی تفہیم پر اصرار کرنا بہت کم اہمیت کا حامل ہے۔ قومی ثقافت کی ایک تحدید جس کی فینن نے نشاندہی کی ہے کہ اس میں استحصال زدہ طبقات کے مسائل کے حل یا تدارک کی کوئی حتمی یقین دہانی نہیں ہے۔ لہذا اس کے قومی ثقافت کے نظریے کا ایک مادی اور اقتصادی پہلو بھی ہے جس کے مطابق فعال ثقافت کی تنقیدی قدر پیمائی ہونا ضروری ہے تاکہ وہ بدلتے ہوئے سماجی و تاریخی حالات کا ساتھ دے سکے۔ اس کی ایک اہم پیش بینی یہ بھی ہے کہ آزادی کے حصول کے بعد کونائزر اور مقامی فرد کے مابین چلنے والی اقتدار کی کشمکش، مقامی اشرافیہ اور مقامی عوام کے مابین کشمکش کی صورت میں سامنے آئے گی جس کے نتیجے میں بدعنوانی اور جبر و استحصال کا سلسلہ جاری رہے گا جیسا کہ ایڈورڈسعید نے فینن کے حوالے سے ایک جگہ لکھا ہے:

''فینن نے کہ تھا کہ ہم نے سفید فام پولیس مین کو اس لئے نکال باہر نہیں کیا کہ کالے یا بھورے پولیس مین ان کی جگہ لے لیں۔ قومی شعور میں سے نیا معاشرتی شعور پیدا ہونا چاہئے۔ یہ ایسی آزمائش ہے جس میں نو آبادیاتی چنگل سے نکلنے والے اکثر ممالک ناکام رہے ہیں۔''(۲)

فینن نے نیشنلزم کے رخنوں اور گمراہیوں کا بڑی وضاحت سے ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ کس طرح کا ڈھانچہ پیدا کرتا ہے اور کس طرح دوسروں پر انحصار کرنے کے رجحان کو بڑھاتا ہے۔ فینن کے خیال میں قومی اور سماجی شعور کے بغیر نو آبادیات کے بعد کی صورتحال سامراجی غلبے اور تسلط کا نیا ہتھیار ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔

ایڈورڈ سعید

ایڈورڈ سعید ۱۹۳۵ء میں بیت المقدس میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق فلسطین کے ایک عیسائی گھرانے سے تھا۔ فلسطین کاتنازعہ شروع ہوا تو ان کے والد اپنے خاندان کے ساتھ قاہرہ منتقل ہوگئے۔ ایڈورڈ سعید نے ابتدائی تعلیم بیت المقدس اور قاہرہ میں جبکہ اعلیٰ تعلیم امریکہ میں حاصل کی۔ وہ کولمبیا یونیورسٹی میں پروفیسر کے فرائض سر انجام دینے کے ساتھ ساتھ بے شمار امریکی یونیورسٹیوں میں مہمان پروفیسر کے طور پر بھی لیکچر دیتے رہے۔ وہ یورپ، ایشیاء اور مشرق وسطیٰ کے متعدد اخباروں میں لکھتے تھے۔

ایڈورڈ سعید پس نو آبادیاتی نظریہ سازی کا اہم ترین نام ہے۔ گو ان کی فکر پر انتو نیتوگرامچی، مشیل فوکو اور فرانز فینن کے بھی اثرات ہیں تاہم پس نو آبادیات کو ایک نظریے اور ایک شعبہ علم کی حیثیت دینے میں ایڈورڈ سعید کا اہم کردار ہے۔ اپنی تصنیف ''مشرق شناسی'' میں سعید کہتا ہے کہ اورئنٹ یعنی شرق کا تصور جن معنوں میں امریکہ، برطانیہ اور فرانس میں پیش کیا جاتا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ عوام کے ذہنوں پر مسلط کیا ہوا ایک خود ساختہ تصور ہے۔ اس بنیادی غلط فہمی کا سبب مشرق اور مغرب کے مابین صدیوں پرانی طاقت کی حرکیات اور بیانیے ہیں۔ ان ابتدائی غلط فہمیوں کا مقصد مشرق میں سامراج کی سرگرمیوں اور بیانیے کو تقویت دینا تھا۔ سعید کا کہنا ہے کہ یہ غلط فہمیاں آج بھی مغرب اور مشرق کے درمیان موجود ہیں۔ مشرق سے متعلق مغرب کے علم کے حوالے سے ایڈورڈ سعید بلاتامل کہتا ہے کہ یہ علم حقائق پر مبنی نہیں ہے بلکہ پہلے سے قائم شدہ اس مفروضے کے حوالے سے ہے کہ مشرقی معاشرے مغربی معاشرے سے متضاد اور بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مماثل ہیں۔ اس نظریے نے مشرق کو مغرب کے لئے غیر مہذب بنا دیا ہے۔ سعید نے طاقت اور علم

کے مابین تعلق پر کھل کر بحث کی ہے اور مشرقِ وسطیٰ، افریقہ اور ایشیاء کی تاریخ اور تہذیب کے حوالے سے مغربی رویوں کا تجزیہ کیا ہے۔

''شرق شناسی مشرق پر مغرب کی حکمرانی اور اختیار رکھنے کے لئے اختیار کردہ ایک تشکیل ہے۔ یہ مفادات کا ایک ایسا تانابانا ہے جو ہر اس موقع پر اپنا اثر دکھاتے ہیں جب مشرق بحیثیت ایک وجود کا سوال ہو۔''(۳)

سعید کہتا ہے کہ سامراج نے اپنے نظام کو طاقت اور علم کے رشتوں کے ذریعے تقویت دی۔ مغرب نے یہ بیانیہ مستقل اپنائے رکھا کہ مغرب کی بہ نسبت مشرق پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ہے۔ لہٰذا مغرب کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مشرق کو ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کے لئے اس کی مدد کرے۔

"شرق شناسی" کے حوالے سے سعید کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس نے سامراج کو مغربی تہذیب کا مرکزی نقطہ بنا دیا۔ مغرب میں گزشتہ چار سو سال کے تاریخی ا ور سیاسی لٹریچر اور ادبی تخلیقات میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ ان کی تہذیب کی تشکیل میں روشن خیالی کا بڑا دخل ہے۔ جمہوریت، جمہوری اقدار اور فکری آزادی کو روشن خیالی کا ایک پہلو قرار دیا جاتا ہے لیکن امپریلزم نے مغربی تہذیب کے خدوخال نمایاں کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے اس کا ذکر کرنے سے ہمیشہ گریز کیا جاتا ہے۔ سعید ''شرق شناسی'' میں صرف متشرقین کے رویوں پر ہی تنقید نہیں کرتا بلکہ طاقت اور علم کا رشتہ، سامراج اور کلچر کا رشتہ اور تہذیبی توسیع پسندی سے علم کا رشتہ بھی دریافت کرتا ہے۔ چنانچہ وہ مغرب کی توسیع پسندی، تسلط اور سامراج کو اس کی تہذیب کا مرکزی نقطہ اور اساسی قوت قرار دیتا ہے۔ فنون لطیفہ، ادب، سیاست اور تاریخ اسی ذیل میں آتے ہیں۔ سعید نے اپنا مؤقف اتنی مہارت، قوت اور استدلال کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اس کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔

ثقافت اور سامراج میں سعید کا کہنا ہے کہ ثقافت کے بارے میں عام طور پر دوطرح کے رویے پائے جاتے ہیں۔ ایک رویہ ثقافت کو معاشرے کے علمی و تہذیبی سرمایے کا ذخیرہ سمجھنے کا ہے۔ دوسرا رویہ ثقافت کو ایک ایسا شناختی امتیاز سمجھنے کا جارحانہ اور خود حفاظتی پر مبنی رویہ ہے جو ''ہم'' اور ''میں'' کے درمیان تفریق کرسکے، اور وہ طاقت مہیاکرے جس کی مدد سے ہم غیر ملکی ثقافی اثرات کو روک سکیں یا کنٹرول کر سکیں۔ یہ رویہ کثیر ثقافتوں اور دوہری شناختوں جیسے روشن خیال فلسفوں کی ضد ہے اور اکثر اوقات مذہبی یا قومی بنیاد پرستی کا سبب بنتا ہے۔ اقبال احمد نے اسی رویے کی نشاندہی اپنے ایک انٹرویو میں کی ہے:

''نیشنلزم پھیلے ہوئے اور منجمد تشخص کا نظریہ ہے۔ اگر تاریخ کی بنیاد پر اجتماعی تشخص قائم کرنا مقصود ہے تو پھر آپ کو تاریخ مسخ کرنا پڑے گی۔''(۴)

سعید کہتا ہے کہ ثقافت کی یہ تعبیر ہمیں ایک ایسے فکری احاطے میں بند کردیتی ہے جس میں ہم باقی دنیا سے ذہنی طور پر علیحدہ ہوجاتے ہیں۔ ''ثقافت اور سامراج'' کے پیش لفظ میں وہ کہتا ہے:

''میرے لئے ثقافت کو اس تناظر میں نہ دیکھنا ایک بڑا چیلنج تھا جو باقی دنیا کے اثرات سے علیحدہ ہو، بلکہ فکری و سماجی سرگرمیوں کا ایک کھلا میدان۔''(۵)

"ثقافت اور سامراج'' میں سعید نے افریقہ، ہندوستان اور مشرق بعید پر لکھے جانے والے یورپین ادب خصوصاً ناول کو دور افتادہ زمینوں پر حکمرانی کرنے کی یورپین کوشش قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نو آبادیاتی اور پس نوآبادیاتی فکشن اس کے اس بیانیے کو تقویت دیتا ہے۔ یہ تحریریں نو آبادیوں کو غیر مہذب وحشیوں سے پرایسی پراسرار زمینوں کے طور پر پیش کرتی ہیں جن کے عوام صرف جارحیت کی زبان سمجھتے ہیں او را س لائق ہیں کہ ان پر حکومت کی جائے۔ یہ نو آبادیوں کے مقامی عوام اور ان کی ثقافتوں کے ضمن میں ایک بڑی غلط فہمی ہے جسے درست کرنے کی ضرورت ہے۔

''تیسری دنیا میں بعد از سامراجی عہد کے مصنفین اپنا ماضی اپنے اندر ہی اٹھائے ہوئے ہیں۔ تذلیل آمیز زخموں کے نشان، مختلف دساتیر کے لئے انگیزش کے طور پر، بعد ازنوآبادیاتی مستقبل کی

جانب ماضی کے رجحان کے نو شباب یافتہ وژنز کے طور پر اور فوراً تعبیر نو اور استعمال کے قابل تجربات کے طور پر، جن میں سابقہ خاموش دیسی آدمی بات کرتا اور عمومی مدافعتی تحریک کے جزو کے طور پرنوآباد کار سے واگزار کروائے ہوئے علاقے پر افعال سرانجام دیتا ہے۔''(۶)

سعید ان بیانیوں اور سامراجی عزائم کے بابین ربط دیکھتا ہے کیونکہ ان بیانیوں میں سب سے اہم چیز جسے نظر انداز کیا گیا ہے وہ مقامی عوام اور ان کی ثقافت ہے۔ اپنے مؤقف کی دلیل کے طور پر وہ دو انگریزی ناولوں چارلس ڈکنس کےThe great expectations اور جوزف کانراڈ کےThe Heart of Darknessکا حوالہ دیتا ہے۔ جوزف کانراڈ کے ناول میں امریکی صنعتکار کا یہ کہنا ہے کہ ہمیں ہی دنیا پر حکومت کرنا ہوگی خواہ دنیا اسے پسند کرے یا نہ کرے، سامراج کی عمومی سوچ ہمارے سامنے لاتا ہے۔ سعید کہتا ہے کہ نئے عالمی نظام کی بنیادی فکر، نیز دنیا کو تہذیب یافتہ بنانے کی اس کی خود ساختہ ذمہ داری اسی بیانیے سے متشکل ہوتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایسی تمام تحریروں کا مرکزہ یہی خیال ہے کہ دنیا میں صرف مغرب ہی اہمیت کا حامل ہے۔ باقی ساری دنیا ذہنی طور پر پسماندہ ہے جس کی اپنی کوئی فکر، تاریخ اور شناخت نہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ان مغربیوں کو دیگر ثقافتوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے بلکہ دراصل وہ کسی بھی متبادل بیانیے کو سنجیدگی سے سمجھنے کی صلاحیت سے یکسر عاری ہیں لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ڈکنس اور کونراڈ کے بعد سامراجی عالمگیریت کے سبب دنیا بدل چکی ہے۔

ہمیں اساسی بصیرت--- لوگوں کا خود کو اپنی ہی سر زمین میں قیدیوں کے طور پر تصور کرنا--- کی اہمیت کو گھٹا کر نہیں پیش کرنا چاہئے کیونکہ یہ سامراج یافتہ دنیا کے ادب میں بار بار ملتی ہے--- یہ موضوعات نو آبادیت سے نکلی ہوئی ثقافتی مدافعت میں سے ابھرتے ہیں--- محصور قوم کو اپنا آپ واپس لوٹانا--- مدافعت کو انسانی تاریخ کو تصور کرنے کا ایک متبادل انداز سمجھنا--- اور تیسرا عنصر علیحدگی پسند قوم پرستی سے ناتا توڑ کر انسانی نجات کے اجتماعی نقطہ نظر کی جانب جانا ہے۔(۷)

سعید کہتا ہے کہ اب بہت سی ثقافتیں ایک دوسرے پر انحصار کی بدولت زندہ ہیں۔ کولونائزڈ اور کولونائزر بھی اب الگ الگ دنیاؤں میں نہیں رہتے۔ لہٰذا یک رخے بیانیے کی اب کوئی جگہ نہیں۔ حتیٰ کہ ان کے لئے بھی نہیں جو سامراجی شکنجے سے آزاد ہونے کے لئے کوشاں ہیں۔انہیں بھی تنگ ذہنی اور انتہاپسندانہ سوچ سے خود کو محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر علی شریعتی

علی شریعتی ۲۳نومبر ۱۹۳۳ء کو مشہد(ایران) کے قریب ایک گاؤں میں تقی شریعتی کے گھر پیدا ہوئے۔ شریعتی نے اپنا بچپن وہیں مزینان میں ہی گزارا اور ابتدائی تعلیم وہیں ایک مکتب سے حاسل کی۔ ۱۹۵۹ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے سنجیدہ مطالعہ اور عملی سرگرمیوں کا آغاز کردیا۔ فرانس میں شریعتی کے قیام کا زمانہ الجزائر میں فرانسیسی استعمار سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد کا زمانہ تھا۔ شریعتی نے الجزائری مسلمانوں کے ساتھ مل کر اس جدوجہد میں حصہ لیا۔ اس دوران ان کے فرانز فینن سے قریبی روابط قائم ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں وطن واپسی کے بعد وہ مشہد یونیورسٹی میں تدریس کے ساتھ ساتھ ایک مذہبی ادارے حسینیہ ارشاد میں بھی لیکچر دیتے رہے۔ یہ دور علی شریعتی کی ملک گیر شہرت کا باعث بنا، جس کی پاداش میں انہیں یونیورسٹی سے جبراً ریٹائر کردیا گیا اور شریعتی کی تحریر و تقاریر پر پابندی عائد کردی گئی۔ چنانچہ انہوں نے ایران کو خیرآباد کہنے کا فیصلہ کیا۔ بعد ازاں لندن میں ۱۹ جون ۱۹۷۷ء کو وہ اپنے کمرے میں پراسرار حالت میں مردہ پائے گئے۔

علی شریعتی کی تصانیف کی تعداد سو سے زائدبتائی جاتی ہے۔ تاہم ان کی اہم تصانیف میں ابو ذرغفاری، فاطمہ فاطمہ ہے، امت و امامت، ماداقبال، بازگشت بہ خویشتن اور خود سازی انقلابی شامل ہیں، جن میں تین نظریات خاص طور پر عوام میں بے حد مقبول ہوئے۔ ایک چہار زندان کا نظریہ، دوسرا خود کی طرف واپسی اور تیسرا غرب زدگی کا نظریہ، ان کے تینوں نظریات باہم مربوط ہونے کے ساتھ ساتھ بالواسطہ طور پر پس نوآبادیاتی نظریے سے بھی انسلاک رکھتے ہیں۔

علی شریعتی کی تصانیف میں مغربی تہذیب کے اثرات کے ضمن میں استعمار کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ استعمار کا لفظ بنیادی طور پر انگریزی لفظcolonialism کے مترادف ہے۔ جس کے معنی استعماریت، استعمار پسندی، نوآبادیاتی نظام، اس نظام کو فروغ دینے والی حکمت عملی اور پالیسی ہے۔ یعنی استعمار کا مفہوم نو آبادی قائم کرنا، کسی آزاد ملک کو غلام بنانا یا کسی دوسرے ملک پر قبضہ کرناہے۔(۸)

شریعتی کے نزدیک مغربی استعمار کی خطرناک ترین شکل ثقافتی اور فکری امپیریلزم ہے جو پہلے تو دیگر اقوام کی فکر اور شناخت کو ختم کرنا ہے، پھر اپنا نفوذ مستحکم کرنے کے بعد اقتصادی اور عسکری یلغار کرتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ فرد اور معاشرے کی تعمیر، تاریخ اور مذہب پر استوار ہوتی ہے۔ اس لئے استعمار مغرب مشرقی اقوام کو ان کی تاریخ اور مذہب سے بیگانہ کرنا چاہتا ہے۔

''جب استعمار ایشیائی اور افریقی ممالک میں ان کو فتح کرنے کے لئے داخل ہوا تو اس پر منکشف ہوا کہ اسلام محض ایک باطنی اور اخلاقی نظام یا محض ایمان بالغیب نہیں ہے بلکہ اس نے اسلام کو اپنے معاشرے پر حکمران اور ہمہ پہلو رہنمائی کرنے والی ایک جارحانہ دیوار کے طور پر اپنے مقابل پایا۔ اسلام اور اس کی تاریخ سے واقفیت پانے کی واجہ سے، نیز اسلامی طرزِ فکر کی اس حرکی خصوصیت کی بنا پر استعمار اسلام کو سب سے زیادہ مفلوج کرنا چاہتا ہے۔ یہ ملتِ اسلامیہ سے اس کی حر کی خصوصیت چھین کر سکون و آرام سے ان کی سرزمینوں کو فتح کرنا چاہتا ہے۔''(۹)

اس خطرے کے تدارک کے لئے شریعتی کے خیال میں فرد اور معاشرے کا اپنی تعمیر کے لئے اپنی تاریخ سے آگاہ اور مربوط ہونا بہت ضروری ہے۔ استعمار کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ مشرق کے عوام کو ان کی تاریخ سے منقطع کردیا جائے۔ اس طرح ان کے لئے مغربی ثقافت کو اپنانا آسان ہوجائے گا۔ کیونکہ ماضی نہ رکھنے والا شخص صفر سے آغاز کرتا ہے اور اپنے ماضی، مذہب اور تاریخ کی شناخت سے عاری ہوجانے والا فرد اور معاشرہ وہ نہیں رہتا جو حرکت اور انقلاب رکھتا ہو۔ شریعتی کے خیال میں:

''استعمار مغرب کی نظرمیں ایک مشرقی کا مغربی ثقافت کے مقابل خود کو حقیر محسوس کرنا ہی مغرب کا مقصد ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک ایسی نسل وجود میں آئے گی جو اپنی ان خوبیوں اور فضائل جن کی وہ حامل ہے، کو برا اور قابل ِ نفرت محسوس کرے گی اور بیگانوں کی برائیاں اسے خوبصورت اور قابلِ تقلید نظر آئیں گی۔''(۱۰)

شریعتی مغربی استعمار کے حربوں کا شکار اس نوع کے کھوکھلے انسانوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ درجہ دوم کے فرنگی نما لوگ ہوتے ہیں جو مغربی سازشوں، استعماری ثقافت اور مغرب کی ہم پر ٹھونسی ہوئی اقدار کا جلد شکار ہوجاتے ہیں۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ یہ مسلمان دانشور ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے استعمار کے ثقافتی امیریلزم والے مکروہ چہرے سے روشن خیالی اور تمدن کا نقاب ہٹا کر اس کی اصلیت واضح کی۔ ایک جدت پسند اسلامی مفکر کی حیثیت سے شریعتی خود کو اسلامی دانشوری کی اس روایت سے منسلک کرتے ہیں اور روشن خیالی کو ایک پیغمبرانہ ذمہ داری قرار دیتے ہیں۔

''ایک ایسے روشن خیال کی حیثیت سے جو اپنے دور کا ذمہ دار ہو اور اپنے زمانے اور اپنی نسل کا ذمہ دار ہو۔ ہمیں اپنی ذمہ داری کا تعین کرنا چاہئے اور وہ اجتماعی کردار جو ایشیائی یا اسلامی معاشرے کے روشن خیال، پڑھے لکھے اور دانشور لوگوں کی ذمہ داری ہے، کا تعین کیا جائے--- کہ ہر ایک سوسائٹی اپنی تاریخ اور تہذیب کی بنیاد پر روشن خیال بنے اور اپنی تاریخ، تہذیب اور عوامی زبان کی بنیاد پراپنی روشن خیالی اور رسالت کے کردار کو ادا کرے اور اس کی بنیاد یہی تین ماٹو ہونے چاہئے: تاریخ، تہذیب اور عوامی زبان۔''(۱۱)

علی شریعتی نے اپنے لئے کمزوروں اور محکوموں کو جابروں اور استحصالی طبقوں سے نجات دلانے والے انقلابی مفکر کا کردار منتخب کیا۔ وہ ایرانی نوجوانوں کو بالخصوص اور مسلمانوں کو

بالعموم جدید علوم سے آگہی کے ساتھ ساتھ حقیقی اسلامی تعلیمات اور روحِ مشرق سے بہرہ مند کرناچاہتے تھے۔

> ''نسلی اور خونی رویوں سے مربوط ہوتے ہوئے بھی ہمارا مقصد غیرملکی اقدار کے حملوں سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی فوری یا حقیقی ذمہ داریوں میں سے ایک یہ ہے کہ ہماری قدیم اقدار اور ان تمام عناصر سے کھلی جنگ ہے کہ جو کسی قوم اور اس کی بصیرت کو کمزور اور اندھا کرتے ہیں اور اسے تخلیقیت،جدیدیت، ترقی اور متواتر تبدیلی سے دور رکھتے ہیں۔''(۱۲)

شریعتی کاکہنا ہے کہ انسان کو اپنی تہذیبی و سماجی ذمہ داریوں سے عہدہ برآہونے اور حقیقی معنوں میں انسان بننے کے لئے چار زندانوں یعنی زندانِ فطرت، زندانِ تاریخ، زندانِ نظامِ اجتماعی اور زندانِ ذات سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے لیکن ایسا صرف وہ انسان کرسکتا ہے جو آگاہی، ارادہ اور تخلیقی استعداد رکھتا ہو۔ اگر وہ مذکورہ صلاحیتوں کا حامل ہے تو علم کے ذریعے پہلے زندان یعنی زندانِ فطرت سے، تاریخیت کے شعور کو بروئے کار لا کر زندانِ تاریخ سے اور سماجی شعور کے ذریعے زندانِ نظامِ اجتماعی سے رہائی پاسکتا ہے۔ چوتھے زندان سے رہائی صرف عشق کے ذریعے ممکن ہے اور عشق سے مراد اپنا سب کچھ ایک مقصد کی خاطر قربان کرنا ہے۔ یہ ایک بے غرض اور عظیم انتخاب ہوتا ہے اور یہی انتخاب انسان کو تاریخ کے بہاؤ پر وہ فیصلہ کن برتری عطا کرتا ہے جس کی امت ِ مسلمہ کو ضرورت ہے۔ علی شریعتی نے اپنے استعمار مخالف جدید اسلامی نظریے کی ترویج سے نوجوانوں میں روحِ انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ حرکت، مبارزت اور تجدید نو کی صور ت میں انقلاب ایران کو فکری پس منظر علی شریعتی کے نظریات نے بھی فراہم کیا۔

حوالہ جات

۱۔ سجاد باقر رضوی، افتادگانِ خاک، فرانز فینن ترجمہ: محمد پرویز، کوئٹہ، قلات پبلشرز ، 2009ء، ص591-592
۲۔ حمید جہلمی، دیباچہ سامراج کے تقابل، ڈیوڈ برسمین ترجمہ ، لاہور، مشعل پبلشرز ،2001ء، ص 23
۳۔ شرق شناسی، ایڈورڈ سعید، ترجمہ:محمد عباس، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2012ء، ص 42
۴م شمولہ سامراج کے تقابل، ص 109
۵۔ ثقافت اور سامراج، ایڈورڈ سعید، ترجمہ: یاسر جواد، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، 2009ء، ص 7
٦۔ ایضاً، ص 190
۷۔ ایضاً، ص 194
۸۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، قومی انگریزی اُردو لغت، اسلام آباد، مقتدہ قومی زبان
۹۔ شبیر افضل خان، علی شریعتی کے انقلابی افکار، اسلام آباد، پورب اکادمی ،2007ء، ص 275
۱۰۔ ایضاً، ص 343
۱۱۔ ایضاً، ص 117
۱۲۔ فن اور مسیحا انتظاری، مشمولہ تخلیق مکرر، جی سی یونیورسٹی لاہور، ص 95